ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

USMAN NOTES
www.usmannotes.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 2954

Program: BS Islamic Studies (Islamic Law & Jurisprudence)

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

(کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ) —(شعبہ شریعہ)

کورس: اسلام کا بین الاقوامی قانون (2954) • سطح: بی ایس علوم اسلامیہ (اسلامک لاء اینڈ جیورس پروڈنس)

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق نمبر 2 (یونٹ نمبر 6 تا 9)

کل نمبر: 100 • کامیابی کے نمبر: 0

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

Reference &For Study — SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس غور سے پڑھیں، تصورات کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر اسائنمنٹ اپنے الفاظ میں لکھیں۔ اس گائیڈ کو ہو بہو نقل کرنے کے بجائے اپنی فہم کے مطابق تحریر کریں۔ جہاں کسی دینی یا قانونی مسئلے میں قطعی رائے درکار ہو وہاں اہلِ علم اور مستند علماء کی طرف رجوع کریں۔

سوال نمبر 1: سفیروں کے مالی امتیازات اور فقہاء کی آراء (20 نمبر)

سوال نمبر 1: سفیروں کے امتیازات مالیہ کو فقہاء کی آراء کی روشنی میں واضح کریں۔ (20)

تعارف

بین الاقوامی قانون میں سفیر کی حیثیت محض ایک پیغام رساں کی نہیں ہوتی، وہ اپنی ریاست اور حکمران کی نمائندگی کرتا ہے، اس لیے اسے ذاتی تحفظ کے ساتھ ساتھ مالی امتیازات بھی دیے جاتے ہیں تاکہ وہ آزادانہ اور بغیر معاشی دباؤ کے اپنے فرائض ادا کر سکے۔ اسلام میں سفیر کے تحفظ کی بنیاد امان کا نظام ہے؛ سفیر اسلامی علاقے میں مستأمن یعنی امان یافتہ شخص کی حیثیت سے داخل ہوتا ہے اور اس کی جان، عزت اور مال سب محفوظ ہو جاتے ہیں۔ فقہائے سیر نے اس اصول کو آگے بڑھا کر سفیر کے مال، اس کے سامان، اس کے ساتھ آنے والے تجارتی اثاثے اور اس کی آمد و رفت پر عائد ہونے والے محصولات کے بارے میں مفصل آراء قائم کیں۔ اس جواب میں پہلے سفارتی امتیاز کا مفہوم و بنیاد واضح کی جائے گی، پھر سفیروں کے مالی امتیازات کی صورتیں یعنی اموال کی حفاظت، محصولاتِ عشر سے استثنیٰ کی بحث، تجارت کی اجازت اور اس کے احکام، تحائف اور قیام کی حدود بیان ہوں گی، اس کے بعد امام ابو حنیفہ اور امام محمد شیبانی سمیت فقہاء کی آراء کا جائزہ موازنہ پیش کیا جائے گا اور آخر میں جدید سفارتی قانون سے مطابقت پر گفتگو کی جائے گی۔

سفارتی امتیاز کا مفہوم اور امان کی بنیاد

امتیاز سے مراد وہ خصوصی قانونی رعایت ہے جو عام شہریوں یا عام غیر ملکیوں کو حاصل نہیں ہوتی مگر سفیر کو اس کے منصب کی وجہ سے دی جاتی ہے۔ مالی امتیازات اس کا وہ حصہ ہیں جن کا تعلق مال و معیشت سے ہے: سفیر کے ذاتی مال کی چھان بین و ضبطی سے حفاظت، اس کے سامان پر محصول کی رعایت، اس کی رہائش و سواری کی سہولت اور اس کے ساتھ آئے ہوئے مال تجارت کے احکام۔ اسلامی قانون میں ان امتیازات کی جڑ امان ہے۔ جب کوئی سفیر اسلامی ریاست کی اجازت یا دعوت سے داخل ہو تو اسے امان حاصل ہو جاتا ہے، اور امان کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی جان کی طرح اس کا مال بھی ہر دست درازی سے محفوظ رہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں آنے والے ایلچیوں کے ساتھ اسی اصول پر عمل ہوا؛ دشمن قبائل کے سفیر بھی مال و سامان سمیت محفوظ واپس گئے۔ فقہاء نے اسی سے یہ قاعدہ بنایا کہ مستأمن کا مال امانت کے حکم میں ہے: اس پر زکاۃ یا جبراً

محصول نہیں لیا جا سکتا اور اگر اس کی زندگی میں کوئی نقصان پہنچے تو اس کی تلافی ریاست کے ذمے آتی ہے۔ یوں مالی امتیاز سفیر کے لیے کوئی فضل و احسان نہیں بلکہ امان کے عقد کا قانونی نتیجہ سمجھا گیا۔

مالی امتیازات کی صورتیں: محصولات اور عشر کی بحث

سفیروں کے مالی امتیازات کی سب سے اہم صورت محصولات، یعنی سرحد یا بازار پر لیے جانے والے ٹیکسوں کی بحث ہے۔ کلاسیکی فقہ میں بیرونی تاجر جب اسلامی علاقے میں مال لے کر آتا تو اس سے عشر یعنی مال کی مالیت کا دسواں حصہ یا باہمی معاملے کے مطابق محصول لیا جاتا تھا؛ امام ابو یوسف نے کتاب الخراج میں اس نظام کی تفصیل دی ہے کہ مسلم تاجر سے ڈھائی فیصد، ذمی سے پانچ فیصد اور بیرونی غیر مسلم تاجر سے دس فیصد تک محصول باہمی برتاؤ کی بنیاد پر لیا جاتا تھا۔ یہی سلوک وہ مسلمان تاجروں سے کرتے ہیں اس کے مطابق لیا جائے۔ مگر سفیر اس عام تاجر سے مختلف ہے: اس کے ذاتی استعمال کا سامان، سفارتی خطوط و دستاویزات اور سفر کا اثاثہ محصول سے مستثنیٰ سمجھا گیا، کیونکہ یہ مال تجارت کے لیے نہیں بلکہ منصب سفارت کے لیے ہے۔ البتہ اگر سفیر اپنے ذاتی سامان سے بڑھ کر مال تجارت ساتھ لائے اور اس سے کاروبار کرے تو فقہاء کے نزدیک اس زائد مال پر مستأمن تاجر کے احکام جاری ہوں گے اور محصول دینا پڑے گا۔ اس فرق سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی قانون امتیاز کو منصب کے تقاضے تک محدود رکھتا ہے اور اسے کاروباری منافع کا ذریعہ بننے نہیں دیتا۔ یہی توازن جدید قانون میں بھی موجود ہے جہاں سفارتی سامان معاف ہوتا ہے مگر سفیر کی نجی تجارت میزبان ملک کے قانون کے تابع رہتی ہے۔

فقہاء کی آراء: قیام کی مدت، تجارت اور مال کی حفاظت

فقہاء کی آراء کا مرکز تین سوال رہے ہیں: سفیر کب تک امتیازی حیثیت برقرار رکھے، اسے تجارت کی کتنی اجازت ہو اور اس کے مال کی حفاظت کا دائرہ کیا ہو۔ امام محمد شیبانی اور دوسرے فقہائے سیر کی آراء کا خلاصہ یہ ہے کہ امان اصل میں عارضی وعدہ ہے؛ عام مستأمن اگر سال بھر قیام کر لے تو اس پر ذمیوں جیسے احکام، خصوصاً جزیے، کی بحث شروع ہو جاتی ہے، کیونکہ طویل قیام عارضی امان کو مستقل بود و باش میں بدل دیتا ہے۔ مگر سفیر کا قیام اس کے عہدے سے مشروط ہوتا ہے؛ جب تک وہ سفارتی مشن پر ہے اس کا امان و امتیاز برقرار رہتا ہے اور مشن ختم ہونے پر اسے محفوظ واپسی کا حق حاصل رہتا ہے۔ تجارت کے بارے میں جمہور فقہاء کی رائے متوازن ہے: معمولی ذاتی خرید و فروخت کی

اجازت ہے، مگر بڑے پیمانے کی باقاعدہ تجارت سفارتی حیثیت سے میل نہیں کھاتی، اور اگر سفیر تجارت کرے تو اس مال پر عام مستامن جیسا محصول و قانون لاگو ہو گا۔ مال کی حفاظت میں فقہاء نے یہ بھی شامل کیا کہ سفیر کی وفات یا واپسی کی صورت میں اس کا مال اس کے ورثاء یا اس کی ریاست تک بحفاظت پہنچایا جائے؛ مال کو جنگی غنیمت یا لاوارث جائیداد سمجھ کر ضبط کرنا امان کی خیانت قرار پایا۔ امام ابو حنیفہ کے ہاں امان کی پاسداری میں اس حد تک سختی ہے کہ امان یافتہ کے مال کو اس کی اجازت کے بغیر استعمال کرنا بھی جائز نہیں رکھا گیا۔

تحائف، رہائش اور سفارتی اخراجات کے احکام

سفیروں کے مالی امتیازات میں سفارتی تحائف اور مہمان نوازی کا مسئلہ بھی شامل ہے۔ اسلامی دربار وا[illegible] لو تحائف دینا اور لینا سفارتی ادب کا حصہ تھا؛ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تحائف قبول بھی کرتے اور اپنے ایلچیوں کے ہاتھ حکمرانوں کو بھیجتے بھی تھے۔ فقہاء کے نزدیک یہ تحائف ذاتی ہدیہ کے بجائے منصب سے متعلق سمجھے جاتے تھے اور بعد کے ادوار میں یہ اصول بنا کہ سفیر کو ملنے والے سرکاری تحائف بیت المال یا ریاست کے حساب میں رکھے جائیں، تاکہ سفارت رشوت و ذاتی مفاد کے شبہے سے پاک رہے۔ یہ اصول آج کے سفارتی ضابطوں میں بھی نظر آتا ہے جہاں عہدے داران کے تحائف ریاست کی ملکیت شمار ہوتے ہیں۔ اسی طرح میزبان ریاست کی جانب سے سفیر کی رہائش، سواری اور قیام کے مناسب انتظام کو اس کے اعزاز کا حصہ سمجھا گیا اور اسلامی تاریخ میں وفود کے لیے مخصوص مہمان خانوں کی روایت قائم ہوئی۔ یہ اخراجات سفیر پر معاشی بوجھ نہیں بنتے تھے، چنانچہ وہ قرض و احسان مندی کے دباؤ سے آزاد ہو کر اپنی ریاست کا مقدمہ پوری آزادی سے پیش کر سکتا تھا۔ ان تمام تفصیلات کا مقصد ایک ہی ہے: سفیر کی مالی خود مختاری و دیانت کی حفاظت، تاکہ اس کا فیصلہ اور اس کی گفتگو کسی لالچ یا محتاجی سے متاثر نہ ہو۔

جدول 1: سفیروں کے مالی امتیازات کا خلاصہ فقہاء کی روشنی میں

حد / شرط	فقہی موقف	امتیاز
امان برقرار رہنے تک؛ واپسی پر مال ساتھ لے جانے کا	امان کی بنا پر مکمل حفاظت؛ ضبطی ممنوع	ذاتی مال و سامان کا تحفظ

حق		
صرف ذاتی وسفارتی استعمال کا سامان	منصب کے سامان پر محصول نہیں	ذاتی سامان پر محصول سے استثنیٰ
محصول باہمی برتاؤ کے مطابق (ابو یوسف کا نظریہ)	تجارت کی صورت میں مستامن تاجر کا حکم	مال تجارت کے احکام
مشن ختم ہونے پر محفوظ واپسی کی ضمانت	مشن کی مدت تک امتیاز برقرار	قیام وامتیاز کی مدت
رشوت وذاتی مفاد کے شبہے سے پاک رکھنا	منصب سے متعلق ذمہ داری کے حساب میں رکھنے کا اصول	سرکاری تحائف

جدید سفارتی قانون سے موازنہ اور تنقیدی جائزہ

جدید بین الاقوامی قانون میں سفارتی امتیازات کا نظام ویانا کنونشن برائے سفارتی تعلقات 1961 میں مدون ہے، جس کے تحت سفیر اور سفارت خانے کو ٹیکسوں اور کسٹم ڈیوٹی سے وسیع استثنیٰ حاصل ہوتا ہے، سفارتی تھیلے اور دستاویزات کھولے نہیں جاسکتے اور سفیر کے خلاف فوجداری کارروائی نہیں ہو سکتی۔ اس نظام کا موازنہ فقہی آراء سے کریں تو تین باتیں نمایاں ہوتی ہیں۔ پہلی، بنیادی اصول دونوں میں ایک ہے: سفارت کی آزادی کے لیے مالی و شخصی تحفظ ضروری ہے۔ دوسری، اسلامی قانون نے اس تحفظ کو عبادتی درجے کی پابندی یعنی امان کی وفاداری سے جوڑا، جبکہ جدید قانون اسے باہمی مفاد و رواج پر رکھتا ہے؛ اسی لیے کلاسیکی فقہ میں امان کی خیانت گناہ کبیرہ کے درجے میں آتی ہے۔ تیسری، فقہاء نے امتیاز کے غلط استعمال پر زیادہ زور دیا ہے: امتیاز ذاتی تجارت و منافع کے لیے ڈھال نہیں بن سکتا اور استثنیٰ ہمیشہ مقصد سفارت تک محدود رہے گا۔ بعض معاصر محققین کی رائے میں فقہی نظام کی یہی مقصدی پابندی جدید نظام کے لیے بھی مفید ہے، کیونکہ آج سفارتی استثنیٰ کے غلط استعمال پر عالمی سطح پر بحث اسی لیے اٹھتی ہے کہ امتیاز اپنی غرض سے ہٹ جاتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فقہاء کی آراء صرف تاریخی اہمیت نہیں رکھتیں بلکہ جدید سفارتی قانون کی اخلاقی تکمیل کا سامان بھی رکھتی ہیں۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ سفیروں کے مالی امتیازات اسلامی قانون میں امان کے اصول سے نکلتے ہیں اور ان کا مقصد سفیر کو مالی دباؤ، محصول و ضبطی کے خوف اور میزبان کی محتاجی سے آزاد رکھنا ہے تاکہ وہ اپنی ریاست کی نمائندگی پوری دیانت سے کر سکے۔ فقہاء کی آراء کے مطابق سفیر کے ذاتی مال و سامان کو تحفظ اور محصول سے استثنیٰ حاصل ہے، اس کے سرکاری تحائف ریاست کے حساب میں رہتے ہیں، اس کا امتیاز اس کے مشن کی مدت تک قائم رہتا ہے، اور اگر وہ تجارت کرے تو اس مال پر عام مستأمن تاجر کے احکام لاگو ہوتے ہیں۔ یہ متوازن نظام امتیاز کو بھی دیتا ہے اور اس کے غلط استعمال کو بھی روکتا ہے۔ جدید ویانا کنونشن سے اس کی حیرت انگیز مطابقت اس بات کا ثبوت ہے کہ فقہائے سیر نے سفارتی قانون کی بنیادیں اس کے باقاعدہ تدوین سے صدیوں پہلے رکھ دی تھیں۔ طالب علم ان آراء کو اسی تاریخی و قانونی تسلسل میں سمجھے تو موضوع پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔

سوال نمبر 2: جنگ بندی کا معاہدہ اور معاہدہ ذمہ پر نوٹ (20 نمبر)

سوال نمبر 2: مندرجہ ذیل پر نوٹ لکھیں۔ 1۔ جنگ بندی کا معاہدہ 2۔ معاہدہ ذمہ (20)

تعارف

اس سوال میں دو ایسے معاہدات پر نوٹ طلب ہے جو فقہ السیر کے سب سے اہم ادارے ہیں۔ جنگ بندی کا معاہدہ، جسے فقہ میں ہدنہ یا موادعت کہا جاتا ہے، ریاستوں کے درمیان دشمنی کو روک کر امن کی مدت مہیا کرتا ہے، جبکہ معاہدہ ذمہ اسلامی ریاست اور اس کے غیر مسلم باشندوں کے درمیان مستقل شہری تعلق قائم کرتا ہے۔ دونوں معاہدے اس حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں کہ اسلامی بین الاقوامی قانون کا مرکز جنگ نہیں بلکہ عہد ہے: جہاں امن ممکن ہو وہاں معاہدہ اس امن کو قانونی صورت دیتا ہے۔ اس نوٹ میں پہلے جنگ بندی کے معاہدے کا مفہوم، شرعی بنیاد، شرائط و مدت، تاریخی مثالیں اور فقہاء کی آراء بیان کی جائیں گی، پھر معاہدہ ذمہ کی تعریف، ارکان و شرائط، فریقین کے حقوق و فرائض اور اس کا تاریخی کردار زیر بحث آئے گا، اور آخر میں دونوں کا باہمی فرق اور مجموعی نتیجہ پیش کیا جائے گا تاکہ دونوں ادارے ایک دوسرے سے پوری طرح متمیز ہو جائیں۔

جنگ بندی کا معاہدہ (ہدنہ): مفہوم اور شرعی بنیاد

ہدنہ کے لغوی معنی سکون و ٹھہراؤ کے ہیں اور اصطلاح میں اس سے مراد مسلمانوں اور کسی غیر مسلم فریق کے درمیان ایک مقررہ مدت کے لیے جنگ بند رکھنے کا معاہدہ ہے، جسے موادعت، مصالحت اور صلح بھی کہا جاتا ہے۔ اس معاہدے کی شرعی بنیاد قرآن کے ان ارشادات میں موجود ہے جن میں مخالف کے صلح کی طرف جھکاؤ پر صلح اختیار کرنے اور معاہدوں کی مدت پوری کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود کئی ہدنوں پر عمل کیا جن میں صلح حدیبیہ سب سے مفصل و مشہور مثال ہے۔ ہدنہ کی ضرورت کئی صورتوں میں پیش آ سکتی ہے: مسلمانوں کی کمزوری یا تیاری کی ضرورت، دوسرے علاقوں کے لوگوں کو اسلام سمجھنے کا موقع دینا، تجارت و آمد و رفت کی بحالی یا بڑی جنگ سے حاصل ہونے والے نقصان سے بچنا۔ اس سے یہ اصول بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں جنگ مقصود بالذات نہیں؛ جہاں امن معاہدے سے مقصد حاصل ہو وہاں فریقین کے خون و مال کی حفاظت معاہدے ہی سے کی جاتی ہے۔ فقہاء نے موادعت کو ریاست کی مصلحت کے تابع رکھا ہے اور اس کا اختیار بھی حکمران یا اس کے مجاز نمائندے کو دیا ہے، افراد اپنی سطح پر جنگ بندی کا معاہدہ کر کے ریاست کو پابند نہیں کر سکتے۔

ہدنہ کی شرائط، مدت اور فقہاء کی آراء

ہدنہ کی صحت و نفاذ کے لیے فقہاء نے چند شرائط بیان کی ہیں: معاہدہ مجاز حکمران یا اس کے سفیر کی طرف سے ہو، اس میں مسلمانوں کی واضح مصلحت ہو، معاہدے کی شرائط کسی قطعی شرعی اصول کے خلاف نہ ہوں، اور اس میں ایسی کوئی شرط نہ ہو جو مسلمانوں کو دائمی طور پر اپنے جائز دفاع سے روک دے یا دین کی صریح تذلیل کا سبب بنے۔ مدت کے بارے میں فقہی اختلاف مشہور ہے: جمہور فقہاء کے نزدیک ہدنہ کی کوئی مقررہ حد نہیں، مصلحت کے مطابق لمبی مدت بھی طے ہو سکتی ہے؛ امام شافعی رحمہ اللہ کے ایک مشہور قول میں حدیبیہ کی مثال کی بنا پر امن کا معاہدہ دس سال سے زیادہ نہ ہونے کی رائے زیر بحث آئی، مگر اسے بھی ضرورت کی صورتوں میں مختلف صورتوں سے جوڑا گیا ہے۔ معاصر علماء کی غالب رائے یہ ہے کہ اقوام متحدہ کے رکن ممالک کے درمیان مستقل امن و عدم جارحیت کے معاہدے بھی ہدنہ و موادعت کے وسیع شرعی دائرے میں آتے ہیں، کیونکہ ریاستوں نے باہمی رضامندی سے جنگ کو خارج از قانون قرار دے رکھا ہے اور شریعت معاہدے کی وفاداری کو لازم قرار دیتی ہے۔ ہدنہ کے دوران دونوں فریق

ایک دوسرے کی سرحدوں، شہریوں اور املاک کا احترام کرتے ہیں؛ اس دوران خفیہ تیاری یا موقع پا کر حملہ خیانت شمار ہوتا ہے، اور اگر دوسرے فریق کی بدعہدی کا یقین ہو جائے تو بھی پہلے معاہدے کے خاتمے کا برابری کی بنیاد پر اعلان ضروری ہے۔ بدنہ ختم ہونے کی صورتیں یہ ہیں: مدت کا اختتام، فریق ثانی کی صریح بدعہدی یا باہمی رضامندی سے فسخ۔

معاہدہ ذمہ: تعریف اور ارکان

ذمہ کے لغوی معنی عہد، امان اور ذمہ داری کے ہیں۔ معاہدہ ذمہ سے مراد وہ مستقل معاہدہ ہے جس کے ذریعے غیر مسلم باشندے اسلامی ریاست کی پناہ و حفاظت میں اس کے مستقل باشندے بن جاتے تھے اور ریاست ان کی جان، مال و عبادت کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے ذمہ لیتی تھی۔ فقہاء نے اس معاہدے کو عقد لازم قرار دیا ہے، یعنی یہ ایک بار طے ہو جانے کے بعد اگلی نسل تک جاری رہتا تھا اور حکمران کی تبدیلی سے ختم نہیں ہوتا تھا۔ اس معاہدے کے ارکان یہ تھے: ایک طرف اسلامی ریاست بطور ضامن حفاظت، دوسری طرف وہ غیر مسلم باشندے جو اسلامی علاقے کو اپنا مستقل وطن بنائیں، اور اس کے بدلے ان کی طرف سے ریاست کے قوانین کی پابندی اور اہل استطاعت بالغ مردوں سے جزیے کی ادائیگی۔ جزیہ کوئی جرمانہ یا مذہبی سزا نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ اس نظام میں اس کی حیثیت دفاعی ذمہ داری سے استثنیٰ اور تحفظ کے بدلے مالی حصے کی تھی؛ اسی لیے بچے، عورتیں، بوڑھے، فقراء، بیمار و معذور اور عبادت میں مشغول راہب اس سے مستثنیٰ رکھے گئے اور جو ذمی فوجی خدمت انجام دے اس سے بھی جزیہ نہیں لیا جاتا تھا۔ معاہدہ ذمہ کے الفاظ و صورتوں میں سیرت و تاریخ میں میثاق مدینہ کی بعض صورتیں، نجران کا معاہدہ اور خلافت راشدہ کے عہد نامے بنیادی نمونے ہیں۔

معاہدہ ذمہ کے تحت فریقین کے حقوق و فرائض

اس معاہدے کے تحت ذمیوں کو جو حقوق ملتے تھے وہ فقہی کتابوں میں تفصیل سے محفوظ ہیں: جان و مال کا مکمل تحفظ اس طرح کہ ذمی کا خون و مال مسلمان کے خون و مال کی طرح محفوظ شمار ہوتا؛ عزت و آبرو کی حفاظت؛ قدیم عبادت گاہوں کی بقا اور ان میں عبادت کی اجازت؛ تجارت، صنعت اور پیشے کی آزادی؛ اپنے عائلی و مذہبی معاملات میں اپنی روایت کے مطابق اندرونی فیصلے کی سہولت؛ اور ظلم کی صورت میں قاضی کے سامنے مسلمان کے خلاف بھی دادرسی کا مکمل حق۔ بدلے میں ان کے فرائض ریاست کے عام

قانون کی پابندی، جزیے کی ادائیگی، ریاست کے خلاف جاسوسی یا دشمن کی مدد سے اجتناب اور عوامی نظم کی رعایت تھے۔ ریاست کی ذمہ داری صرف قانون نافذ کرنا نہیں تھا بلکہ بیرونی حملے سے ان کا دفاع بھی اسی طرح لازم تھا جیسے مسلمان شہریوں کا؛ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں جب ایک مسلم سپہ سالار کی زیادتی کی شکایت آئی تو ذمی کو پورا انصاف دیا گیا اور آپ نے یہ مشہور بات فرمائی کہ لوگ آزاد پیدا ہوئے ہیں۔ اس نظام کا تاریخی مطالعہ بتاتا ہے کہ قرونِ وسطیٰ کے عالمی پس منظر میں یہ معاہدہ غیر مسلم اقلیتوں کے لیے بقا و تحفظ کا ایک منظم قانونی ادارہ تھا۔ آج کے دور میں ریاستوں میں شہریت برابری کی آئینی بنیاد پر ملتی ہے اور غیر مسلم شہری اسی آئینی معاہدے کو جدید صورت میں رکھتے ہیں، مگر تحفظ و انصاف کی وہی روح آج بھی قائم ہے۔

جدول 1: جنگ بندی کے معاہدے اور معاہدہ ذمہ کا فرق

معاہدہ ذمہ	جنگ بندی کا معاہدہ (ہدنہ)	پہلو
اسلامی ریاست اور اس کے غیر مسلم باشندے	دو ریاستیں / مسلم ریاست و غیر مسلم فریق	فریقین
مستقل بود و باش و تحفظ کا شہری تعلق قائم کرنا	مقررہ یا مستقل مدت کے لیے جنگ روکنا	مقصد
مستقل و نسل در نسل جاری رہنے والا عقد	عموماً مقررہ مدت؛ مصلحت کے تابع	مدت
ذمی دار الاسلام کے اندر رہتے ہیں	فریق ثانی اپنے علاقے میں رہتا ہے	علاقائی حیثیت
اہل استطاعت مردوں سے جزیہ؛ دفاع و تحفظ ریاست کے ذمے	معاہدے کی شرائط کے مطابق صورتیں ممکن	مالی پہلو

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ جنگ بندی کا معاہدہ یعنی ہدنہ ریاستوں کے درمیان جنگ روک کر امن قائم کرنے کا معاہدہ ہے جس کی بنیاد صلح کی ترغیب اور وفائے عہد پر ہے، اس کی مدت و شرائط مصلحت کے تابع ہیں اور اس کی خیانت سخت ممنوع ہے۔ معاہدہ ذمہ اس سے الگ ایک داخلی و شہری معاہدہ تھا جس کے ذریعے غیر مسلم باشندوں کو جان، مال و عبادت کا مکمل قانونی تحفظ ملتا تھا اور وہ بدلے میں قانون کی پابندی و جزیے کی ادائیگی کے پابند ہوتے تھے۔ دونوں معاہدات مل کر یہ دکھاتے ہیں کہ اسلامی نظام میں ریاستیں جنگ سے نہیں عہد سے جڑتی ہیں، اور غیر مسلم انسان خواہ باہر کا شہری ہو یا اندر کا باشندہ، اس کے حقوق معاہدے کی صورت میں واضح و محفوظ رکھے گئے ہیں۔ طالب علم کو دونوں کے فرق و مقاصد کو الگ الگ ذہن نشین کرنا چاہیے کیونکہ امتحانی سوال میں بھی یہی تقابلی پہلو اصل مطلوب ہوتا ہے

سوال نمبر 3: جہاد کا مفہوم اور اس کی اقسام (20 نمبر)

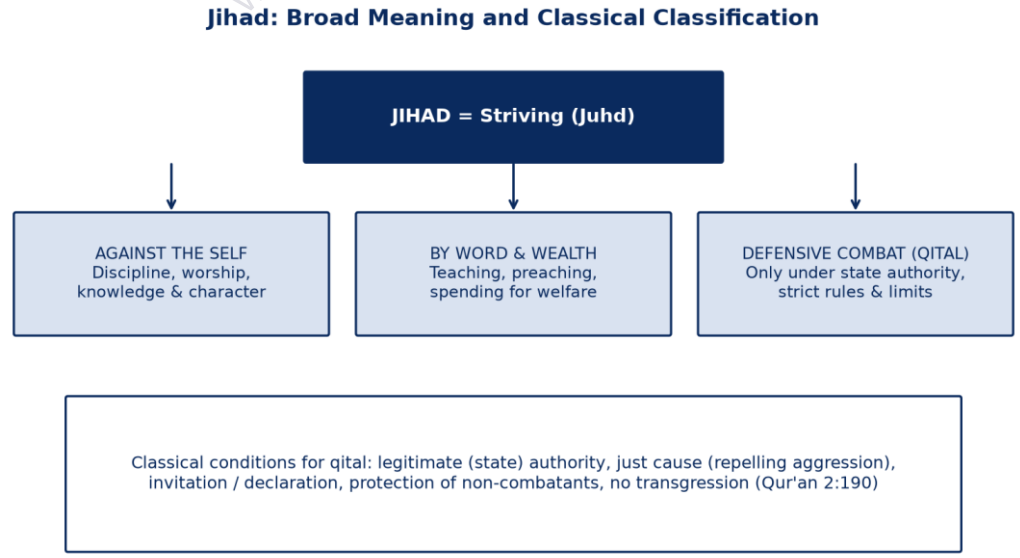
سوال نمبر 3: جہاد کا مفہوم لکھیں۔ نیز جہاد کے اقسام پر تفصیلی نوٹ قلم بند کریں۔ (20)

تعارف

جہاد اسلامی تعلیمات کی اہم اصطلاحات میں سے ہے، مگر اس کے مفہوم کو اکثر اوقات نہایت محدود کر کے صرف جنگ سمجھ لیا جاتا ہے، حالانکہ لغوی و شرعی مطالعہ بتاتا ہے کہ جہاد کا دائرہ اس سے کہیں وسیع ہے۔ قرآن و سنت میں یہ لفظ انسان کی پوری دینی جدوجہد کے لیے استعمال ہوا ہے جس میں اپنے نفس کی اصلاح، علم و دعوت کی محنت، مال کی قربانی اور موقع آنے پر مظلوم کے دفاع میں ریاست کے نظام کے تحت حصہ داری سب شامل ہیں۔ اس جواب میں پہلے جہاد کے لغوی و اصطلاحی مفہوم کو واضح کیا جائے گا، پھر اس کی اقسام کو ترتیب سے بیان کیا جائے گا، قتال یعنی مسلح دفاع سے متعلق قسم کی کلاسیکی شرائط و حدود کا تعلیمی جائزہ لیا جائے گا اور آخر میں اس بات کی وضاحت کی جائے گی کہ اس پوری بحث کا اطلاق و فیصلہ ریاست اور اہل علم کے دائرے میں ہے۔ اس موضوع کو خالص علمی و تاریخی انداز میں پڑھنا چاہیے، کیونکہ یہ فقہی کتابوں کا مطالعہ ہے، کسی عملی کارروائی کی ترغیب نہیں۔

جہاد کا لغوی و اصطلاحی مفہوم

جہاد عربی لفظ جہد سے بنا ہے جس کے معنی کوشش، محنت اور اپنی پوری توانائی کسی مقصد میں صرف کر دینے کے ہیں۔ اسی مادے سے اجتہاد ہے جس میں فقیہ اپنی پوری فکری قوت حکم شرعی کی تلاش میں لگاتا ہے۔ اصطلاح شریعت میں جہاد سے مراد اللہ کی رضا کے لیے دین کی سربلندی، حق کی حفاظت اور ظلم کے مقابلے میں اپنی استطاعت کے مطابق کوشش کرنا ہے؛ اس میں زبان کی کوشش بھی ہے، مال کی بھی، قلم کی بھی اور بحالات خاص جسمانی جدوجہد بھی۔ اس مفہوم کی تائید قرآن کی ان آیات سے ہوتی ہے جن میں مال و جان کے ساتھ جہاد کا ذکر مشورے، دعوت اور دفاع سب سیاقوں میں آیا ہے اور حدیث میں واپس آنے والے مجاہدین سے فرمایا گیا کہ تم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹے ہو، یعنی نفس کے خلاف محنت، جسے اہل علم نے اس اصطلاح کی وسعت کی دلیل بنایا ہے۔ فقہاء نے قتال کو جہاد کی ایک قسم کے طور پر الگ اصطلاح میں بھی بیان کیا ہے؛ یہی وجہ ہے کہ کتاب الجہاد کے ابواب میں زیادہ تر مباحث ریاستی دفاع اور جنگ کے قانون کے گرد گھومتی ہیں، مگر اصطلاح کا عمومی مفہوم اس سے وسیع رکھا گیا ہے۔ اس فرق کو سمجھے بغیر نہ کلاسیکی کتب سمجھ آتی ہیں نہ جدید بحث۔



تصویر 1: جہاد کا وسیع مفہوم اور اس کی کلاسیکی اقسام۔

قسم اول: جہاد بالنفس اور جہاد بالعلم والدعوہ

جہاد کی پہلی اور بنیادی قسم اپنے نفس کے خلاف جدوجہد ہے۔ انسان کو اپنی خواہشات، غصے، حسد، تکبر اور سستی پر قابو پا کر عبادت، سچائی اور نیکی پر قائم رہنا مسلسل محنت مانگتا ہے؛ اسی کو علماء نے جہاد اکبر کی تشریح میں رکھا اور صوفیائے کرام نے اسی کی تربیت کو اپنی خانقاہی نظام کی بنیاد بنایا۔ اس قسم کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ہر مسلمان پر ہر وقت لازم ہے اور اس میں کوئی دوسرا انسان متاثر نہیں ہوتا؛ اس کا میدان انسان کا اپنا دل و کردار ہے۔ دوسری قسم جہاد باللسان والعلم، یعنی زبان، علم اور دعوت کی جدوجہد ہے۔ اس میں دین کا علم سیکھنا و سکھانا، حق بات کو حکمت سے پہنچانا، ظلم و غلط بات کے مقابلے میں سچ کہنا اور قلم و تحریر سے دینی و علمی خدمت کرنا شامل ہے۔ حکمران کے سامنے کلمہ حق کہنے کو حدیث میں افضل جہاد قرار دیا گیا ہے جو اس قسم کی قدر و قیمت کو ظاہر کرتا ہے۔ آج کے دور میں تعلیم، تحقیق، میڈیا اور پرامن دعوتی و اصلاحی کام اسی قسم کا تسلسل ہیں، اور امت کی اکثریت کی عملی زندگی کا جہاد عملی طور پر انہی دو قسموں پر مشتمل ہوتا ہے۔

قسم دوم: جہاد بالمال اور اجتماعی فلاح کی جدوجہد

تیسری قسم جہاد بالمال ہے، یعنی اپنے مال کو اللہ کی راہ میں، دین کی اشاعت، محتاجوں کی مدد، تعلیمی اداروں اور اجتماعی فلاح کے کاموں میں خرچ کرنا۔ قرآن میں مال و جان کا ذکر عموماً ساتھ آیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مالی قربانی اس جدوجہد کا مستقل حصہ ہے۔ اس قسم میں زکاۃ و صدقات سے بڑھ کر رضاکارانہ انفاق، یتیموں و بیواؤں کی کفالت اور قدرتی آفات میں متاثرین کی مدد جیسی صورتیں بھی داخل سمجھی جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ جہاد کی ایک اور عملی صورت جہاد بالعمل والخدمہ ہے جسے بعض معاصر علماء نے الگ بیان کیا ہے: یعنی اپنے پیشے، دفتر، کھیت، کارخانے اور ادارے میں دیانت و اتقان سے کام کر کے قوم و دین کی خدمت کرنا۔ ان تمام اقسام کا مطالعہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ عام ذہن میں جہاد کی جو یک رخا تصویر بن گئی ہے اس کی اصلاح ہو اور معلوم ہو کہ اسلامی تصور میں نیکی و خدمت کی ہر سنجیدہ کوشش اس مقدس اصطلاح کے سائے میں آتی ہے۔ اقتصادی و سماجی میدانوں کی یہ کوششیں کسی ریاست یا اجازت کی محتاج بھی نہیں، بلکہ یہ ہر فرد کا روزمرہ دینی فریضہ ہے۔

قسم سوم: جہاد بالقتال — کلاسیکی شرائط و حدود (تعلیمی جائزہ)

جہاد کی وہ قسم جس پر فقہ کی کتابوں میں سب سے زیادہ قانونی تفصیل ملتی ہے قتال ہے، یعنی ریاست کے باقاعدہ فیصلے سے کی جانے والی مسلح دفاعی کارروائی۔ کلاسیکی فقہاء نے اسے اپنی ذات میں مقصود نہیں قرار دیا؛ ان کے ہاں اس کا مقصد ظلم و ہارحیت کا خاتمہ، مظلوموں کی حفاظت اور امن کی بحالی تھا، اسی لیے قرآن میں لڑنے کی اجازت کی پہلی آیات ان کے حق میں نازل ہوئیں جن پر ظلم ہوا تھا اور یہ بھی واضح کیا گیا کہ حد سے تجاوز نہ کرو، اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ فقہاء نے اس قسم کی مشروعی شرائط بیان کیں: یہ ریاست و صاحب اختیار کی ذمہ داری ہے، افراد یا گروہ اس کا اعلان نہیں کر سکتے؛ اس سے پہلے دعوت و مذاکرات اور صلح کی راہیں اختیار کی جائیں؛ جنگجو اور غیر جنگجو کا فرق ہر حال میں قائم رکھا جائے، عورتوں، بچوں، بوڑھوں، بیماروں، راہبوں اور کھیتی باڑی و مزدوری میں لگے عام لوگوں کو قتل کرنا ممنوع ہے؛ درختوں، فصلوں اور عبادت گاہوں کو بلاضرورت تباہ نہیں کیا جائے گا؛ اور صلح ہو جانے پر فوراً جنگ بند ہو جائے گی۔ فرضیت کے درجے میں فقہاء نے اسے عموماً ریاست کی سطح پر فرض کفایہ کہا، اور صرف اس وقت ہر اہل فرد پر دفاع لازم ٹھہرایا جب وطن پر اچانک حملہ ہو جائے؛ یہ سب بحث تاریخی و دستوری سیاق کی ہے جس کا عمل درآمد آج ریاستوں، ان کے آئین اور بین الاقوامی قانون کے دائرے میں ہوتا ہے۔

جدول 1: جہاد کی اقسام کا خلاصہ

قسم	میدان	طریقہ / ذریعہ
جہاد بالنفس	اپنے دل و کردار کی اصلاح	خواہشات پر قابو، عبادت و اخلاق پر استقامت
جہاد بالعلم واللسان	علم، دعوت و حق گوئی	تعلیم، قلم، حکمت سے گفتگو، ظالم کے سامنے سچ کہنا
جہاد بالمال	مال کی قربانی و فلاح	انفاق، کفالت، تعلیمی و فلاحی اداروں کا قیام
جہاد بالعمل والخدمہ	پیشہ و معاشرے کی خدمت	دیانت، اتقان، عوامی خدمت

صرف ریاستی فیصلے سے، سخت شرائط وانسانی حدود کے ساتھ	ریاستی دفاع، مظلوم کا تحفظ	جہاد بالقتال (دفاعی)

اقسام کا باہمی تعلق اور اہم تنبیہ

ان اقسام کا باہمی تعلق یوں سمجھنا چاہیے کہ یہ ایک سیڑھی کی طرح ہیں جس کی بنیاد نفس کی تربیت ہے اور اس کی بالائی صورتیں اجتماعی خدمت و دفاع ہیں؛ جو شخص پہلی اقسام میں کمزور ہو وہ آخری قسم کے آداب کی پاسداری بھی مشکل سے کر سکتا ہے، اسی لیے کلاسیکی علماء نے پہلی کی تربیت و تقویٰ پر خاص زور دیا۔ یہاں یہ تنبیہ نہایت ضروری ہے کہ یہ موضوع خالص تعلیمی و فقہی مطالعہ ہے۔ کسی بھی عملی صورت کے بارے میں شرعی رائے دینا مستند علماء کا کام ہے اور مسلح امور کا فیصلہ سراسر ریاست و اس کے آئینی اداروں کا اختیار ہے؛ شریعت نے بغاوت، انارکی اور نجی جنگ کو باقاعدہ ممنوع قرار دیا ہے اور مسلمان کو اپنے ملک کے قانون اور کیے ہوئے معاہدوں کا پابند رکھا ہے۔ جدید ریاستوں کے شہری مسلمان بھی اسی اصول کے تحت اپنے آئین و قانون کے پابند ہیں۔ طالب علم اس موضوع کو اسی فہم کے ساتھ پڑھے تو وہ کلاسیکی نصوص کو بھی درست سمجھے گا اور اپنے دور کی ذمہ داری کو بھی۔ اسی محتاط فہم کے ساتھ اس باب کو ختم کیا جاتا ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ جہاد کے لغوی معنی پوری توانائی سے کوشش کرنے کے ہیں اور شرعی اصطلاح میں یہ اللہ کی رضا کے لیے حق کی حفاظت و سربلندی کی ہر سنجیدہ جدوجہد کو شامل ہے۔ اس کی اقسام میں جہاد بالنفس، جہاد بالعلم واللسان، جہاد بالمال، خدمت و عمل کی جدوجہد اور آخر میں ریاستی سطح کا دفاعی قتال آتا ہے، جس کے لیے فقہاء نے سخت شرائط، انسانی حدود اور ریاستی اختیار کی قیدیں رکھی ہیں۔ اصل زندگی میں مسلمان کی جدوجہد کی اکثریت پہلی اقسام پر مشتمل ہوتی ہے، اور یہی وسیع مفہوم اس اصطلاح کی اصل روح ہے۔ اس موضوع کے اطلاق سے متعلق فیصلے اہل علم و ریاست کے دائرے میں ہیں؛ طالب علم کا کام اسے علمی دیانت کے ساتھ سمجھنا اور اپنے کردار و خدمت میں اس کے مثبت پہلوؤں کو اختیار کرنا ہے۔

سوال نمبر 4: شریعت اسلامیہ کی روشنی میں ذمیوں کے فرائض (20 نمبر)

سوال نمبر 4: شریعت اسلامیہ کی روشنی میں ذمیوں کے فرائض پر تفصیل کے ساتھ بحث کریں۔ (20)

تعارف

معاہدہ ذمہ دو طرفہ قانونی تعلق تھا: ایک طرف اسلامی ریاست ذمیوں کی جان، مال اور عبادت کی حفاظت کی ضامن تھی اور دوسری طرف ذمیوں پر بھی کچھ فرائض عائد ہوتے تھے جن کی ادائیگی سے یہ معاہدہ قائم رہتا تھا۔ عام بحث میں ذمیوں کے حقوق کا ذکر بہت ہوتا ہے، مگر اس سوال کا مطالبہ ان کے فرائض کا مفصل مطالعہ ہے، اس لیے اس جواب میں فرائض کو مرکزی حیثیت دی جائے گی، البتہ توازن کے لیے یہ بھی واضح کیا جائے گا کہ ہر فریضے کے مقابل ریاست کی ذمہ داری کیا تھی، کیونکہ فرائض کو حقوق سے الگ کر کے دیکھنا کلاسیکی نظام کی تصویر کو نامکمل کر دیتا ہے۔ ذیل میں جزیے کی ادائیگی، قانون کی پابندی، ریاست سے وفاداری، عوامی نظم و شعائر کا احترام، تجارتی و مالی قواعد کی رعایت اور معاہدے کی خلاف ورزی کے نتائج کو ترتیب سے بیان کیا جائے گا۔ یہ بحث خالص تاریخی و فقہی مطالعہ ہے؛ موجودہ دور میں مسلم و غیر مسلم تمام شہری اپنے اپنے ملک کے آئین و قانون کے تحت برابر شہری فرائض رکھتے ہیں اور اسی تناظر میں اس کلاسیکی مواد کو سمجھنا چاہیے۔

فریضہ اول: جزیے کی ادائیگی

ذمیوں کا سب سے نمایاں فریضہ جزیے کی ادائیگی تھا۔ جزیہ وہ مقررہ سالانہ رقم تھی جو استطاعت رکھنے والے بالغ و تندرست غیر مسلم مردوں سے لی جاتی تھی؛ عورتیں، بچے، بوڑھے، فقراء، بے روزگار، بیمار و معذور اور عبادت میں وقف راہب اس سے مستثنیٰ تھے، اور اگر کوئی ذمی مالی استطاعت نہ رکھتا تو اس سے جبراً وصولی نہیں کی جاتی تھی بلکہ تاریخی روایات میں ایسے افراد کو بیت المال سے وظیفہ ملنے کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ جزیے کی مقدار و تقسیم میں فقہاء نے علاقے و استطاعت کا لحاظ رکھا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں اہل ثروت، متوسط اور غریب طبقات کے لیے الگ الگ مناسب شرحیں مقرر ہونے کی روایت ملتی ہے۔ اس کی شرعی حیثیت یہ سمجھی جاتی تھی کہ یہ ذمی کا اس تحفظ و دفاعی نظام میں مالی حصہ تھا جس سے وہ خود فوجی خدمت سے مستثنیٰ رہ کر فائدہ اٹھاتا تھا؛ اسی بنا پر جو ذمی باقاعدہ فوج میں بھرتی ہو کر لڑتا اس سے جزیہ ساقط ہو جاتا تھا، اور

اگر ریاست کسی علاقے کے ذمیوں کا دفاع نہ کر سکتی تو وصول شدہ جزیہ واپس کرنے کی تاریخی مثالیں بھی موجود ہیں، جن میں شام کے بعض شہروں کا مشہور واقعہ شامل ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ جزیہ یک طرفہ محصول نہیں بلکہ معاہدے کا باہمی جز تھا۔

فریضہ دوم: ریاست کے قانون اور امن عامہ کی پابندی

ذمیوں کا دوسرا بڑا فریضہ اسلامی ریاست کے عام قانون کی پابندی تھا۔ قتل، چوری، زنا، ڈاکا اور دھوکا دہی جیسے جرائم میں ان پر وہی تعزیری نظام لاگو ہوتا تھا جو عوامی نظم و اخلاق سے متعلق تھا، اور فقہاء کی تصریح کے مطابق ذمی قاضی کی عدالت میں مسلمان کی طرح حاضر ہونے اور فیصلہ ماننے کے پابند تھے۔ اپنے باہمی عائلی و مذہبی معاملات، نکاح و وراثت وغیرہ میں انہیں اپنی مذہبی روایت پر چلنے کی آزادی تھی، مگر جب کوئی مقدمہ اسلامی عدالت میں آتا تو عدالتی ضابطے کی پابندی دونوں فریقوں پر لازم ہوتی۔ امن عامہ کی پابندی میں یہ بھی شامل تھا کہ وہ مسلمانوں کے مذہبی شعائر و جذبات کی کھلی توہین سے باز رہیں، شراب و خنزیر جیسی اشیاء کی مسلمانوں کے علاقوں میں کھلی نمائش و تجارت نہ کریں، اور اپنے تہوار و عبادت اس انداز سے منائیں کہ عوامی نظم خراب نہ ہو۔ ان پابندیوں کا مقصد مذہبی آزادی سلب کرنا نہیں تھا بلکہ کثیر المذاہب معاشرے میں باہمی احترام و امن قائم رکھنا تھا؛ ان کے اپنے اندرونی معاملات اور گھروں و عبادت گاہوں کے اندر کے اعمال میں کسی مداخلت کی گنجائش فقہاء نے نہیں دی۔ یہی توازن آج کے کثیر الثقافتی معاشروں میں بھی برادریوں کے پرامن بقائے باہمی کی بنیاد ہے۔

فریضہ سوم: ریاست سے وفاداری اور دشمن کی مدد سے اجتناب

تیسرا فریضہ ریاست سے وفاداری اور اس کے دشمنوں کی مدد سے مکمل اجتناب تھا۔ معاہدہ ذمہ کی روح یہی تھی کہ جس ریاست کی ضمانت میں تحفظ حاصل ہو اس کے خلاف جاسوسی، بغاوت یا بیرونی دشمن کی اعانت نہ کی جائے۔ فقہاء کے نزدیک ذمی کا دشمن کے لیے جاسوسی کرنا یا مسلمانوں کے راز ان تک پہنچانا عقد ذمہ کی سنگین خلاف ورزی تھا اور اس پر سخت تعزیری کارروائی کی گنجائش موجود تھی۔ اس کے مقابل ریاست کی بھی ذمہ داری تھی کہ وہ اسی وفاداری کا بدلہ پورے تحفظ و انصاف سے دے۔ اس فریضے کا دوسرا پہلو داخلی معاملات میں تعاون تھا: ذمی تاجر و کاشت کار و اہل صنعت اپنے کاروبار سے ریاست کی معیشت میں حصہ ڈالتے، مالیات و ٹیکسوں کے عام قواعد کی پابندی کرتے اور

فصلوں پر عائد خراج یعنی زمین کا محصول ادا کرتے تھے۔ خراج جزیے سے الگ چیز تھا؛ یہ زمین پر لگنے والا محصول تھا جو مسلم زمیندار پر عشر کی صورت اور ذمی زمیندار پر خراج کی صورت میں ہو سکتا تھا اور اس کا تعلق مذہب سے زیادہ زمین کی قانونی حیثیت سے تھا۔ اس طرح ذمی آبادی ریاست کی معاشی زندگی کا باقاعدہ حصہ تھی اور ان کے فرائض محض چند پابندیوں کا نام نہیں بلکہ شہری شرکت کا ایک نظام تھا۔

فریضہ چہارم: باہمی احترام، تجارتی ایمان داری اور خلاف ورزی کے نتائج

چوتھا دائرہ فرائض باہمی معاشرتی احترام و لین دین کی امانت کا ہے۔ ذمیوں پر لازم تھا کہ تجارتی معاملات میں مسلمانوں کے ساتھ وہی ایمان داری برتیں جو عام قانون چاہتا ہے: ناپ تول میں کمی، جعلی سکے، ذخیرہ اندوزی اور سود خوروں کے ساتھ وہ طرز عمل جو قانون عام میں ممنوع تھا، ان کے لیے بھی ممنوع تھا۔ اسی طرح رہائش و تعمیرات کے بارے میں فقہی کتابوں میں کچھ تاریخی شرائط مذکور ہیں، مثلاً بعض فقہاء کے ہاں نئے عبادت خانوں کی تعمیر و بلند عمارتوں سے متعلق مقامی قواعد کی پابندی؛ ان شرائط میں مذاہب فقہ اور ادوار کے لحاظ سے خاصا اختلاف ملتا ہے اور ان کا اطلاق ہمیشہ مقامی حالات و حکمران کے فیصلے سے مشروط رہا، اس لیے انہیں متفق علیہ فرائض کی فہرست میں نہیں رکھا جا سکتا۔ خلاف ورزی کے نتائج کے بارے میں فقہاء کی رائے میں نرمی قابل غور ہے: انفرادی جرم سے پورے طبقے کا معاہدہ ختم نہیں ہوتا تھا؛ جزیے کی عدم ادائیگی یا کسی ایک فریضے کی خلاف ورزی پر مجرم کو سزا یا تادیب ہوتی مگر عقد ذمہ اسی وقت ختم سمجھا جاتا تھا جب کوئی شخص باقاعدہ بغاوت کر کے دشمن سے جا ملے یا ریاست کے خلاف مسلح خروج کرے۔ یہ تناسب و انفراد کا اصول اسلامی قانون کے انصاف کی خوب صورت مثال ہے کہ جرم کی سزا صرف مجرم تک رہے، اس کی برادری تک نہ پھیلے۔

جدول 1: ذمیوں کے فرائض اور ان کے مقابل ریاست کی ذمہ داری

فریضہ (ذمیوں پر)	تفصیل	مقابل ذمہ داری (ریاست پر)
جزیے کی ادائیگی	اہل استطاعت بالغ مرد؛ کمزور طبقات مستثنیٰ	جان و مال کا تحفظ و بیرونی دفاع؛ دفاع نہ ہو تو جزیہ واپس

بلا تفریق انصاف و عدالت تک رسائی	فوجداری و عوامی نظم کے قوانین سب پر یکساں	قانون کی پابندی
ان کے حقوق و عبادت گاہوں کی پوری حفاظت	جاسوسی و دشمن کی مدد سے اجتناب	ریاست سے وفاداری
منڈیوں و پیشوں میں بلا رکاوٹ شرکت کا حق	قابل کاشت زمین پر محصول؛ تجارت میں امانت	خراج و مالی قواعد
ان کے تہوار و مذہبی آزادی کا احترام	شعائر و جذبات کی کھلی توہین سے پرہیز	عوامی احترام

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ شریعت کی کلاسیکی ترتیب میں ذمیوں کے فرائض چار بڑے دائروں میں آتے ہیں: استطاعت کی حد تک سے جزیے کی ادائیگی، ریاست کے عام قانون و امن عامہ کی پابندی، ریاست سے وفاداری و دشمن کی مدد سے اجتناب، اور معاشرتی احترام و تجارتی امانت کی رعایت۔ ان فرائض کی ذیل میں خصوصیات انفراد، تناسب اور استطاعت کی رعایت ہیں: کمزور طبقات کو معاف رکھا گیا، جرم کی سزا مجرم تک محدود رہی اور فرائض کے بدلے میں ریاست پر تحفظ و انصاف کی مکمل ذمہ داری عائد ہوئی۔ یہ نظام اپنے دور کا شہری معاہدہ تھا؛ آج کے دور میں اس کی جگہ آئینی شہریت نے لے لی ہے جس میں تمام طبقات کے فرائض و حقوق دستور سے متعین ہوتے ہیں۔ طالب علم کو اس باب کو تاریخی فقہی نظام کے مطالعے کے طور پر سمجھنا چاہیے اور اس کے اصول یعنی باہمی معاہدہ، وفاداری اور انصاف آج کے شہری اخلاق میں بھی زندہ دیکھنے چاہئیں۔

سوال نمبر 5: افراد اور املاک پر جنگ کے اثرات (20 نمبر)

سوال نمبر 5: شریعت اسلامیہ کی روشنی میں افراد اور املاک پر جنگ کے اثرات کو تفصیل کے ساتھ قلم بند کریں۔ (20)

تعارف

جب دو ریاستوں کے درمیان جنگ کی حالت پیدا ہوتی ہے تو اس کے اثرات صرف میدان جنگ تک محدود نہیں رہتے؛ سفارتی تعلقات، معاہدات، دشمن ملک کے شہریوں کی قانونی حیثیت، قیدیوں و زخمیوں کا درجہ اور نجی و سرکاری املاک کی حیثیت سب اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ اسلامی قانون نے اس صورت حال کو غیر منظم چھوڑنے کے بجائے اس کے ہر پہلو کو قواعد کے تحت لایا: کسے تحفظ ملے گا، کس مال کو ہاتھ لگ سکتا ہے، قیدیوں کے ساتھ کیا برتاؤ ہو گا اور جنگ ختم ہونے پر کیا صورتیں بحال ہوں گی۔ اس جواب میں پہلے افراد پر جنگ کے اثرات یعنی سفارت کاروں، مستأمنین، عام شہریوں، جنگجوؤں، قیدیوں و زخمیوں کی حیثیت بیان کی جائے گی، پھر املاک پر اثرات یعنی سرکاری و نجی املاک، غنیمت کے احکام، عبادت گاہوں و زرعی املاک کے تحفظ کو زیر بحث لایا جائے گا، اور آخر میں جنگ کے خاتمے کے بعد کے اثرات اور جدید انسانی قانون سے موازنہ پیش کیا جائے گا۔ یہ مطالعہ بھی خالص علمی و تاریخی ہے اور اس کا اطلاق ریاستوں اور بین الاقوامی اداروں کے دائرے میں ہے۔

افراد پر اثرات اول: سفارتی تعلقات، مستأمنین اور عام شہری

جنگ شروع ہونے کا پہلا اثر سفارتی تعلقات پر پڑتا ہے: دونوں ریاستوں کے سفیر واپس بلا لیے جاتے ہیں، سفارت خانے بند ہوتے ہیں اور کھلے ہوئے معاہدات میں سے جنگ کے ساتھ تباہ نہ ہونے والے احکام عملاً رک جاتے ہیں۔ مگر اسلامی قانون نے اس خاتمے کے اندر بھی انسانیت کی حدود قائم رکھیں: جانے والے سفیر کو محفوظ واپسی، اس کے مال و سامان کو حفاظت اور مناسب مہلت دی جاتی ہے، دشمنی کی حالت سفیر کی بے حرمتی کا جواز نہیں بنتی۔ اسی طرح جو غیر مسلم افراد امان لے کر اسلامی علاقے میں موجود ہوں یعنی مستأمنین، جنگ چھڑ جانے کے باوجود ان کا امان برقرار رہتا ہے؛ فقہاء نے انہیں اپنے وطن بحفاظت پہنچنے کا پورا موقع دیا اور ان کے مال کو ان کے ساتھ واپس بھیجنے کا حکم برقرار رکھا۔ دشمن ملک کے عام شہریوں کے بارے میں بنیادی اصول غیر جنگجوؤں کا تحفظ ہے: عورتیں، بچے، بوڑھے، بیمار، معذور، راہب اور کھیتوں و کارخانوں میں مصروف عام لوگ جنگ کے نشانے سے باہر قرار پائے، اور انہیں قصداً نقصان پہنچانا حد سے تجاوز میں شمار ہوا۔ یہ تفریق دراصل آج کے بین الاقوامی انسانی قانون کی بنیاد جنگجو و غیر جنگجو کے فرق سے پوری طرح ہم آہنگ ہے اور ظاہر کرتی ہے کہ اسلامی قانون میں جنگ افراد کے خلاف نہیں، جارحیت کے خلاف ہوتی ہے۔

افراد پر اثرات دوم: جنگجو، قیدی اور زخمی

میدان جنگ کے اصل جنگجوؤں کے بارے میں بھی اسلامی قانون نے بے قید خشونت کی کوئی صورت نہیں رکھی۔ ہتھیار ڈال دینے یا گرفتار ہو جانے کے بعد جنگجو قیدی بن جاتا ہے اور اسی لمحے اس کی جان کو تحفظ مل جاتا ہے۔ جنگی قیدیوں کے بارے میں قرآن نے دو ہی باعزت صورتیں رکھیں: احسان کے طور پر بغیر بدلے رہائی یا فدیہ لے کر رہائی، اور سیرت میں اسیران بدر سمیت کئی مواقع پر رہائی، فدیے اور تعلیم کے بدلے آزادی کی مثالیں موجود ہیں۔ قیدیوں کو خوراک و لباس دینا، انہیں اذیت و تذلیل سے بچانا اور ان کی ماؤں و بچوں کو جدا نہ کرنا فقہی و سیرتی ہدایات میں شامل ہے۔ زخمیوں کے بارے میں حکم اس سے بھی واضح ہے: جو زخمی لڑنے کے قابل نہ رہے اس پر حملہ ممنوع ہے اور اس کے علاج کی رعایت انسانی فریضہ ہے۔ بھاگتے ہوئے کا پیچھا، مردوں کی لاشوں کی بے حرمتی یعنی مثلہ اور پکڑے گئے بیمار و زخمیوں کو قتل کرنا صریحاً ممنوع قرار پایا۔ جنگ کے دوران پکڑے گئے جاسوس اور باغیوں کے معاملات فقہاء نے عام قیدیوں سے الگ رکھے اور ان میں بھی فیصلہ عدالت و ریاست کے اختیار میں دیا، کسی سپاہی کو ذاتی انتقام کا حق نہیں دیا گیا۔ ان تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ جنگ کی حالت میں بھی فرد بے قانون نہیں ہو جاتا، اس کے حقوق کا ایک حصہ ہر حال میں باقی رہتا ہے۔

املاک پر اثرات: سرکاری املاک، غنیمت اور نجی ملکیت

املاک پر جنگ کے اثرات کو سمجھنے کے لیے فقہاء نے املاک کو تین حصوں میں پرکھا ہے۔ پہلی قسم دشمن ریاست کی سرکاری و عسکری املاک ہیں، مثلاً اسلحہ، رسد، فوجی چھاؤنیاں اور ریاستی خزانے سے متعلق جنگی سامان؛ یہی درحقیقت مال غنیمت کی اصل صورت ہے جو جنگی کامیابی کی صورت میں ریاست کے اختیار میں آتا ہے۔ غنیمت کے بارے میں قرآن نے باقاعدہ تقسیم مقرر کی: خمس یعنی پانچواں حصہ اللہ و رسول، قرابت داروں، یتیموں، مساکین اور مسافروں کے لیے اور باقی حصہ شریک مجاہدین کے لیے، اور اس تقسیم کا اختیار سردار و ریاست کو دے کر لوٹ مار و انفرادی قبضے کو جرم قرار دیا گیا؛ امانت سے پہلے مال اٹھا لینا یعنی غلول سخت گناہ کہا گیا۔ دوسری قسم عام شہریوں کی نجی املاک ہیں: گھر، دکانیں، ذاتی سامان و نقدی؛ یہ اصولاً غنیمت نہیں بنتیں، کیونکہ جنگ ریاستوں کے درمیان ہوتی ہے افراد کی ذاتی جائیداد سے اس کا کوئی براہ راست تعلق نہیں بنتا، اور

کلاسیکی فقہاء نے غیر جنگجوؤں کی املاک کی حفاظت کو اسی اصول کے تحت بیان کیا ہے۔ تیسری قسم عبادت گاہیں، مزارات، باغات، فصلیں، کنویں اور نہریں ہیں جن کی تباہی بقدر ضرورت ممنوع رکھی گئی؛ درخت کاٹنے و فصلیں جلانے کی ممانعت کی سیرتی ہدایات اسی باب میں آتی ہیں اور ضرورت کے بغیر تباہی کو فساد قرار دیا گیا ہے۔

فتح شدہ علاقے، جنگ کے اختتام اور جدید انسانی قانون سے موازنہ

اگر جنگ کے نتیجے میں کوئی علاقہ فتح ہو جائے تو وہاں کے باشندوں کی حیثیت امان و صلح کے معاہدوں سے متعین ہوتی تھی۔ صلح سے حاصل علاقے کی زمین و املاک پرانے مالکوں کے پاس رہتی اور ان پر طے شدہ شرائط لاگو ہوتیں، جبکہ جنگ سے حاصل علاقے کی زمینوں کے بارے میں فقہاء نے ریاست کو عوامی مصلحت دیکھ کر فیصلے کا اختیار دیا جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا سواد عراق کی زمینیں اصل کاشت کاروں کے پاس رکھ کر خراج مقرر کرنے کا مشہور فیصلہ سب سے بڑی مثال ہے؛ اس فیصلے نے سرزمین کی ملکیت و کاشت کے استقرار کو نسلوں تک محفوظ رکھا۔ جنگ ختم ہو جانے پر اثرات بھی ختم ہونے لگتے ہیں: قیدی تبادلے و رہائی کے معاہدے ہوتے ہیں، امن بحال ہوتے ہی تجارت و آمد و رفت کے امان پھر جاری ہو جاتے ہیں اور جن شہریوں نے صلحی علاقوں میں رہنا قبول کیا ہو ان کے حقوق نئے معاہدے کے تحت محفوظ ہو جاتے ہیں۔ جدید جنیوا کنونشنز و بین الاقوامی انسانی قانون سے موازنہ کریں تو غیر جنگجوؤں کا تحفظ، قیدیوں کے انسانی حقوق، طبی عملے و زخمیوں کی حفاظت، ثقافتی و مذہبی املاک کا احترام اور ضرورت و تناسب کے اصول اسلامی فقہ کے انہی کلاسیکی مباحث سے نمایاں مشابہت رکھتے ہیں۔ اس مشابہت کی وجہ تاریخی اثر سے زیادہ انسانی عدل کی مشترکہ بنیاد ہے، اور فقہاء کی تدوین ان اصولوں کی قدیم ترین منظم صورتوں میں سے ہے۔

جدول 1: جنگ کے اثرات کا خلاصہ — افراد و املاک

موضوع	جنگ کا اثر	تحفظ / حد
سفیر و مستأمنین	سفارتی تعلقات ختم؛ امان یافتہ افراد زیر بحث	محفوظ واپسی، مال کی حفاظت، امان برقرار
غیر جنگجو شہری	براہ راست نشانہ بننے کا خدشہ	قتل و نقصان ممنوع؛ جان و مال محفوظ

خوراک، علاج، اذیت و مثلہ ممنوع؛ رہائی احسان یا فدیے سے	آزادی سلب، قید کی حالت	جنگی قیدی و زخمی
غنیمت کی باقاعدہ تقسیم، لوٹ مار (غلول) بر	ریاست کے اختیار میں آنا	سرکاری / عسکری املاک
اصولاً محفوظ؛ عبادت گاہیں، فصلیں و درخت بلا ضرورت تباہ نہیں	فتح کی صورت میں حیثیت زیر بحث	نجی و مذہبی املاک

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ شریعت اسلامیہ کی روشنی میں جنگ کے اثرات محدود و مقید ہیں: افراد میں سفیر و مستأمن کا امان برقرار رہتا ہے، غیر جنگجو ہر حال میں مامون ہیں، قیدی و زخمی کے انسانی حقوق ختم نہیں ہوتے؛ املاک میں صرف ریاستی و عسکری وسائل غنیمت کے نظام کے تحت آتے ہیں جس کی تقسیم قانون کے تابع ہے، جبکہ نجی املاک، عبادت گاہیں اور پیداواری وسائل اصولاً محفوظ رہتے ہیں اور ان کی بلا ضرورت تباہی فساد ہے۔ جنگ کے خاتمے کے ساتھ ہی قیدیوں کی رہائی، صلح و امان کی بحالی اور معمول کے تعلقات کی واپسی اس نظام کا طبعی انجام ہے۔ ان قواعد کا مقصد جنگ کو انسانی دائرے میں قید رکھنا ہے، اور یہی قواعد آج کے بین الاقوامی انسانی قانون سے گہری مطابقت رکھتے ہیں۔ ان تمام امور کے فیصلے و اطلاق کا اختیار ریاستوں و مجاز اداروں کو ہے؛ یہ مطالعہ خالص تعلیمی ہے۔